## (۱۱) ابوزبید

یہ شخص بھی بنوطے کا رہنے والا تھا۔ اور شاعر تھا۔ حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا بڑا مقرب دوست تھا۔ اس کا انتقال ۶۴۵ء میں ہوا۔

## (۱۲) سموعل

اس کا نام سموعل یا صموئیل تھا اس کے باپ کا نام عادیا تھا۔ یہ ایک یہودی رئیس تھا، اس کا قلعہ ابلق بہت محفوظ اور مشہور قلعہ تھا یہودیوں کا وطن دراصل ملک شام تھا اور ان کی زبان سُریانی تھی۔ تقریباً ۷۰ء میں رومی بت پرستوں نے ان پر حملہ کر کے ان کو تباہ کیا تو یہ بھاگ کر عرب کی وادیوں میں پناہ گزیں ہوئے اور انھوں نے بھی عربوں کی زبان اختیار کر لی تھی انھیں میں ایک رئیس زادہ سموئل بھی تھا جو امرؤ القیس کا ہم عصر اور شاعری میں اس کا ہم پلہ تھا۔ جب امرؤ القیس بنو اسد سے اپنے باپ کا انتقام لے رہا تھا تو شاہانِ حیرہ نے مختلف قبائل عرب کو امرؤ القیس کے خلاف اُبھار دیا اس وقت امرؤ القیس نے بھی قیصر رُوم سے مدد لینی چاہی اور قیصر رُوم کے پاس سفارش کا خط لینے کے لئے وہ سموئل کے پاس گیا۔ وہاں سے وہ سفارشی خط لے کر جب قیصر روم کے پاس جانے لگا تو اُس نے اپنے چند ہتھیار اور زرہیں سموئل کے پاس امانۃً رکھ دیں اور اس سے وعدہ لے لیا کہ وہ ان کو کسی دوسرے کو نہ دے گا۔ حیرہ کے بادشاہ منذر کو پتہ لگا کہ امرؤ القیس اپنے ہتھیار سموئل کے پاس امانۃً رکھ آیا ہے اس نے سموئل کے پاس اپنا قاصد بھیجا کہ وہ زرہیں دراصل میری ہیں لہٰذا زرہیں تم مجھے دے دو۔ سموئل نے کہا میں امانت میں کسی حالت میں بھی خیانت نہ کروں گا۔ منذر نے ایک جرنیل کو فوج دے کر بھیجا کہ بہ جبر سموئل سے زرہیں لے آئے۔ اس جرنیل نے ہر چند سموئل کو سمجھایا مگر اس نے خیانت کرنے سے انکار کر دیا اور وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اتفاق سے سموئل کا بیٹا جنگل سے شکار کھیل کر قلعہ واپس آرہا تھا کہ منذر کی فوج نے اسے پکڑ لیا۔ اب جرنیل نے سموئل کے پاس کہلایا کہ وہ زرہیں میرے سپرد کر دو تو تمہارے لڑکے کو چھوڑ دوں گا ورنہ اس کی جان

کی خیریت نہیں۔ سموئل نے کہا کہ لڑکا تو مرنے کے لئے پیدا ہی ہوا ہے تم چاہے کچھ کرڈالو میں وعدہ پورا کروں گا اور امرؤالقیس کی امانت اس کے سوا اور کسی کو نہ دوں گا۔ چنانچہ اُس جرنیل نے سموئل کے سامنے لڑکے کو قتل کیا۔ سموئل دیکھتا اور برداشت کرتا رہا مگر وہ اپنے عہد پر قائم رہا اور وعدہ خلافی اور امانت میں خیانت گوارا نہ کی۔ اس کا ایک قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے۔

اذا المرء لم یدنس من اللوم عرضه　　فکل رداء یرتدیه جمیل

عربی کے بہترین قصائد میں سے ہے جس میں فخر۔ وفاء عہد۔ حسن اخلاق کا مضمون نہایت عمدگی سے ادا کیا ہے۔

## (۱۳) عدی

اس کا نام عدی اور اس کے باپ کا نام زید تھا۔ یہ نہایت فاضل۔ ذی اثر اور ہر لعزیز شخص تھا۔ کہتے ہیں کہ نعمان اسی کی بدولت تخت سلطنت تک پہونچا۔ جب نعمان بادشاہ ہو گیا تو اس نے اس کی قدردانی میں اسے اپنی بیٹی بیاہ دی۔ مگر ایک بار یہی نعمان کسی بات پر اس سے ناخوش ہو گیا تو اس نے اسے قید کر دیا۔ اگرچہ ایران کے بادشاہ کسریٰ نے بھی نعمان کو اس کی سفارش لکھی تھی کہ اُسے رہا کر دے لیکن نعمان اسے قتل کر چکا تھا۔ یہ واقعہ ۵۸۲ء کا ہے اس کا کلام نہایت پُر تاثیر ہوتا ہے۔ اس کے یہاں رندی اور پرہیزگاری دونوں قسم کے مضامین پائے جاتے ہیں۔

## (۱۴) ربیع

اس کا نام ربیع اور اس کے باپ کا نام ابی الحقیق تھا۔ یہ بھی یہودی تھا اور مدینہ کے قریب ہی ایک بستی میں رہتا تھا۔ یہ شخص جیسا عمدہ شاعر تھا ویسا ہی عمدہ سوار اور ویسا ہی بہادر بھی تھا۔ یہ نابغہ کا ہم عصر تھا۔ اور شاعری میں اس کا حریف۔ جنگ بعاث میں یہ شخص بہت دلیری سے لڑا تھا۔

## شواعر　یعنی شاعر عورتیں

عرب کی سرزمین اگرچہ بظاہر نہایت پتھریلی۔ ریتیلی۔ بنجر۔ اُوسر۔ چٹیل اور جنگل تھی مگر

ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے اس کے شکم میں بے شمار معادن اور بیش قیمت ذخائر امانت رکھ دیئے تھے جو آج سونا۔ پٹرول۔ پلے ٹینگم و دیگر اشیاء کی شکل میں برآمد ہو رہے ہیں اور اقوامِ عالم کے لئے موجبِ حیرت بن رہے ہیں اور دوسری طرف مرد تو مرد عورتوں تک کو ذہانت۔ قوتِ حافظہ۔ سلامتِ فہم۔ زبان آوری اور شاعری کے فضائل عطا ہوئے۔ چنانچہ عرب کی بعض شاعر عورتوں کا حال یہاں لکھا جاتا ہے :۔

۱۔ ام ثابت :۔ یہ تابّط شرا کی ماں تھی۔ یہ بھی مشہور شاعرہ تھی۔ اتفاق سے تابّط شرا اسی کے سامنے مرگیا تو اس نے اپنے بیٹے کے ماتم میں جو مرثیے کہے ہیں وہ بڑے زور کے ہیں۔ خاص کر وہ قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے :۔ لیس شعری ضلّۃٌ ۔ اَیُّ شیئٍ قتلک

۲۔ عمرۃ الخثعمیہ : اس کے دو بیٹوں کا اچانک انتقال ہو گیا اس جانکاہ حادثہ پر اس نے بڑے دل دوز مرثیے کہے ہیں۔

۳۔ عاتکہ :۔ یہ خواجہ عبد المطلب کی بیٹی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں یہ بھی شعر کہتی تھیں۔ جنگ فجار کے متعلق ان کے اشعار نہایت پُر تاثیر ہیں۔

۴۔ بنت بہدل :۔ یہ بنو طے کی ایک شاعرہ تھی۔ اس نے اپنے باپ کا مرثیہ بہت زور کا کہا ہے۔

۵۔ زینب :۔ بنت طریہ۔ اس نے اپنے بھائی یزید کا مرثیہ بہت پُر تاثیر کہا ہے۔

۶۔ ام الصریح :۔ یہ بنو کندہ کی رہنے والی تھی۔ اور کہا جاتا ہے کہ مرثیہ گوئی میں یہ اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔

۷۔ سلمیٰ :۔ یہ زہیر اور خنساء کی بہن تھیں۔ اہلِ خاندان کی صحبت اور اثر سے انھوں نے بھی شعر کہنے شروع کر دیئے تھے۔

۸۔ خنساء :۔ شاعر عورتوں میں یہ درجۂ اول کی شاعرہ تھیں کہ نہ جاہلیت میں کوئی شاعرہ ان کی ہمسر تھی نہ اسلام میں۔ ان کا اصلی نام تماضر تھا۔ ان کے باپ ابو سلمیٰ تھے، یہ دولت مند گھرانے کی لڑکی تھیں حسین تھیں۔ شاعرہ تھیں اس لئے دوسرے قبائل کے

بڑے بڑے رؤسا نے ان کو نکاح کا پیغام دیا مگر انھوں نے قبیلہ سے باہر نکاح کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی قوم میں نکاح کیا۔ یہ دولت اسلام سے بھی مشرف ہوئی تھیں۔ زہیر اور کعب ان کے دو بھائی تھے اور دونوں بڑے شاعر تھے۔ کعب بھی اسلام لائے تھے۔ ایک بار خنسا نے اپنے شعر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائے تھے تو حضورؐ نے بہت پسند فرمائے اور فرمایا کہ "اے خناسی! اور سناؤ"۔ ان کے ایک بھائی صخر تھے وہ قضا کر گئے تو انھیں بہت صدمہ ہوا۔ ان پر کئی مرثیے کہے اور بہت دردناک مرثیے کہے جو عموماً مشہور ہیں۔ خیال تھا کہ یہ اسلام لانے کے بعد یہ صخر پر رنج و ماتم ختم کر دیں گی مگر چونکہ یہ ان کو بہت چاہتی تھیں یہ اسلام کے بعد بھی برابر ان پر روتی رنج کرتی اور مرثیہ کہتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔ کہتی تھیں کہ اسلام سے قبل تو میں صخر پر اس لئے روتی تھی کہ قوم کے لوگ اس کا خون بے کار نہ جانے دیں بلکہ اس کا انتقام ضرور لیں لیکن اسلام کے بعد اب اس پر روتی ہوں کہ وہ جہنم میں گئے۔

مگر یہی روتی رہنے اور بے صبری ظاہر کرنے والی بی بی —— جب خود ان کے ایک چھوڑ چار چار جوان بیٹے جنگ قادسیہ میں شہید ہو گئے تو صبر کئے خاموش بیٹھی رہیں اور کہا بھی تو یہ کہا کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ان کے شہید ہونے کے باعث مجھے بھی ایک شرف بخشا۔ اب امید ہے کہ اللہ کے دارِ رحمت (جنت) میں ہم سب اکٹھا اور یکجا ہوں گے۔ ۲۴ھ میں بعہد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ آپ کا انتقال ہوا۔

ان کے اشعار نہایت عمدہ ہوتے۔ الفاظ نہایت نرم۔ مضامین نہایت معقول اور شیریں۔ بندش نہایت پختہ ہوتی۔ ان کے کلام میں فخر اور مرثیہ کے مضامین زیادہ ہیں ان کے علاوہ رابطہ بنت عاصم۔ جلیلہ بنت مرّہ اور اسلامی عہد میں حضرت سیدہ خاتون جنت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا۔ لیلی العفیفہ۔ خرنق بنت بدر۔ لیلیٰ اخیلیہ۔ وغیرہ بہت سی قابل ذکر شاعر خواتین تھیں۔ لیکن اس وقت اسی قدر کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

# ابن خلدون اور اس کا مقدمہ

(از جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد)

## (۲)

سلسلہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے برہان بابت ماہ مئی ۱۹۵۷ء

۷- ابن خلدون جان دار مفکر ہے، وہ بے کار احکام نہیں صادر کرتا اور اپنے میلانِ طبع یا خواہشِ نفس سے کسی طرف نہیں جھکتا۔ بلکہ وہ اپنے کل نتائج کو ان چیزوں پر مبنی کرتا ہے جو اجتماعِ انسانی میں مشاہدہ میں آتی ہیں یا جنکی اسے خبر پہنچی ہے یا جن کو اس نے پوری طرح سمجھ لیا ہے یا جو دلائل سے ثابت ہیں۔ ابن خلدون بے جا غرور سے دور ہے حالاں کہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک فن کا موجد ہے اگرچہ درحقیقت وہ ایک کا نہیں دو فنوں کا موجد ہے اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اہلِ علم ایسے ہی ہوتے ہیں، ابن خلدون میں یہ رنگ غالب ہے کہ وہ سلف کے طریقہ سے الگ ہونا پسند نہیں کرتا اور امورِ دینیہ خواہ عقائد سے تعلق رکھتے ہوں یا عبادات سے۔ ان کے ظاہر کو اختیار کرتا ہے اور اعتقاد رکھتا ہے کہ انسانی عقل اس عالم کے حقائق خواہ وہ طبیعیہ ہوں یا الٰہیہ، کے ادراک سے عاجز ہے۔ ضروری ہے کہ اس میں شرع پر اعتماد کیا جائے۔ قرآن مجید نے جو کچھ بتایا ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ مروی ہے یا اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عطا سے وہبی طریقہ پر جو ظاہر ہو۔ وہ اس بارے میں ابن حزم ظاہری (ت ۴۵۶ھ ۱۰۶۴م) کے مشابہ ہے۔ تاہم جب وہ عمرانیات پر بحث کرتا ہے اور حالتِ طبیعیہ اور حالتِ اجتماعیہ کو اور ان چیزوں کو جو ان دونوں سے تعلق رکھتی ہیں خواہ وہ مادی ہوں یا معنوی اور ان چیزوں کو جو ان دونوں میں عارض ہوتی ہیں۔ ان کو چھیڑتا ہے تو اس کا پورا اعتماد عقل کے منطقی قیاسات، طبائع کائنات اور نظر و بصیرت کو حکم بنانے پر ہوتا ہے۔ پس ابن خلدون کا ظاہری مسلک اور سلفی مذہب ان امور میں ہے جو الٰہیات سے متعلق ہیں۔ مثلاً روح اور بعث اور حقیقتِ وجود جن کے متعلق فلسفیوں کا فیصلہ ہے کہ ان کا ادراک اختیارِ انسانی کے احاطہ سے باہر ہے اور ایجابی طریقہ پر وہ ان براہین وقیاسات کے ماتحت نہیں ہیں جو اس عالم پر صادق آتے ہیں جس کو محیط ہے۔ امورِ مذکورہ بالا کے علاوہ دوسرے امور میں وہ فیلسوف عقلی طبیعی واقعی ہے

جس کا یہ اعتقاد ہے کہ ہمارے عالم مادی و اجتماعی اور نفسانی میں جو امور جاری و ساری ہیں وہ معین قوانین کے ماتحت ہیں اور ایک نظام مخصوص پر چل رہے ہیں۔ پھر وہ امور مکرر پائے جاتے ہیں جب کہ وہ اسباب جن کے اثر سے وہ پہلے ظاہر ہوئے تھے موجود ہو جائیں۔ ابن خلدون کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ یہ حوادث اس کے خلاف جاری نہیں ہو سکتے کیوں کہ یہ جزو ہے اس نظامِ شامل کا جو عمرانِ بشری اور اجتماعِ انسانی پر غالب ہے۔"

ابن خلدون کا اسلوب اپنے بیان میں نہایت صاف اور محکم ہے اور بالخصوص دیباچہ جس میں طرح طرح کی معنوی اور لفظی صناعتیں جمع ہیں اور جو پے در پے سجعوں پر مبنی ہے۔ یہ اسلوب طبعی اور آمد کے طور پر جاری ہے اور وہ اس اسلوب میں معانی اور آراء کو ان کی حقیقی صورتوں میں ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ ابن خلدون کبھی کبھی لغوی سانچے بھی بناتا ہے، روحِ معنی کو بچا لینے کے لئے اور مباحث کی تقدیر اور نتائج و غایات کی وضاحت کے لئے ابن خلدون کو یہ چیز بہت مرغوب ہے کہ مقدمہ کی فصلوں میں سے ہر فصل کو قرآن کریم کی ایک آیت یا چند آیتوں یا آیات قرآن کے اقتباس پر ختم کرے، اس طرح پر کہ وہ آیت اس بحث کے مناسب ہو جو اس فصل میں مذکور ہے اور بسا اوقات ایک فصل کو آیتوں سے مزین کرتا ہے ان میں سے ایک آیت کا ختمِ فصل پر لانا ضروری خیال کرتا ہے اور باقی آیات کا کسی مستقل نظریہ کے ختم میں جو اس فصل میں بیان کیا گیا ہے۔ ابن خلدون کا اسلوب صاف ہونے کے علاوہ سیدھا بھی ہے جس سے ذوقِ لغوی اور ذوقِ ادبی اور موضوعاتِ عقلیہ اور مباحثِ اجتماعیہ و ادبیہ کے بیان پر قادر ہونے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اور اس جہت سے اس کا اسلوب ابن المقفع کے اسلوب سے زیادہ عمیق اور جاحظ کے اسلوب سے زیادہ اشمل ہے۔ ابن خلدون کے کچھ خاص لغوی استعمالات ہیں جنہیں ہم یہاں مستقل موضوع نہیں بنا سکتے لیکن ان میں سے بعض پر مطلع کر دینا ضروری ہے کیونکہ ان کا فلسفہ ابن خلدون کے سمجھنے سے گہرا تعلق ہے۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ وہ "عرب" کا لفظ بدو اور اعراب" (بادیہ یعنی صحرا میں رہنے والے) کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی لفظ "بدو" کو وسیع معنی میں بھی استعمال کرتا ہے کہ دیہات کے رہنے والے کاشتکاروں کو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کہ بدو حضر کے مقابلہ میں بادیہ کے معنے میں ہے اور یہ صحیح لفظ ہے کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ اسی طرح لفظ

"توحش" کو شہر سے دور مقام پر سکونت پذیر ہونے کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ وہ معنی نہیں لیتا جس کی طرف عام طور پر ذہن جاتا ہے یعنی طبیعت میں وحشت۔ نیز لفظ "عمران" کو اس پر اطلاق کرتا ہے جسے ہم لوگ آج تک "اجتماع" کہتے ہیں پس علم العمران ابن خلدون کے یہاں وہی علم ہے جو ہم لوگوں کے نزدیک علم الاجتماع ہے۔

## (اس کی جو رائیں مقدمہ میں ہیں ان کی تحلیل)

ابن خلدون کا مقدمہ طبیعی، اجتماعی، نفسی، لغوی، اور ادبی رایوں سے مالامال ہے لیکن ان رایوں کی دو واضح قسمیں نکلتی ہیں (۱) آرائے مستعرضہ یعنی علما اور فلاسفہ کی وہ رائیں جنھیں ابن خلدون نے ضمناً بیان کیا ہے اور پھر ان پر نقد و تبصرہ کیا ہے یہ وہ رائیں ہیں جو بالعموم علوم طبیعیہ یا فلسفۂ عقلیہ سے متعلق ہیں (۲) آرائے اصلیہ۔ یہ وہ رائے ہیں جن کے لیے ابن خلدون نے مقدمہ لکھا ہے اور یہ وسیع تر معنی میں آرائے اجتماعیہ ہی ہیں۔ اور گو کہ مقدمہ ابن خلدون کے درس سے مقصود آرائے اجتماعیہ اصلیہ ہیں لیکن مناسب ہے کہ ہم کسی قدر آرائے مستعرضہ کا بھی ذکر کر دیں کیوں کہ ان سے بھی کسی درجہ میں ابن خلدون کا فلسفیانہ رجحان ظاہر ہوتا ہے۔

**۱- آرائے مستعرضہ** ابن خلدون نے اول مقدمہ میں (ص ۴۴-۸۵) جغرافیہ وصقبہ کو بیان کیا ہے جیسا کہ ان حکما کی کتابوں میں بیان ہوا ہے جو احوالِ عالم میں غور کرنے والے ہیں، ان رایوں کے مثل ہم عرب کے جغرافیہ نویسوں یا اخوان الصفا کے یہاں یا حی بن یقظان کے قصہ میں پاتے ہیں۔ پھر اس نے خلافت اور خلافت کے شروط میں امت کے اختلاف کو (ص ۱۹۰-۲۰۲-۲۱۰) اور حکومت کے دینی و سیاسی و اداری مناصب مثلاً قضا و وزارۃ و دیوان الرسائل و دیوان الجبایۃ والسکۃ (العملۃ)... (ص ۲۱۸-۲۷۹) کو اور مہدی کو اور ان کے بارے میں لوگوں کے مذاہب اور حکومتوں کی ابتدا اور خوں ریزیوں اور جفر کو (ص ۳۱۱-۳۴۴) بیان کیا ہے۔ اور فصل سادس (ص ۴۲۹ اور اس کے بعد) میں علم و تعلیم کو ذکر کیا ہے اس میں علوم اسلامیہ شرعیہ کے اقسام مثلاً تفسیر قرآن و حدیث و فقہ و علم کلام و تصوف اور علوم عقلیہ و طبیعیہ مثلاً حساب و ہندسہ و فلکیات و منطق و طبیعیات و الٰہیات و کیمیا و خاص فلسفہ اور طب و کاشتکاری و سحر و تنجیم کو (ص ۴۲۷-۵۳۱)

اس کے باوجود یہ فصلیں بھی قوی شخصی نظریات سے یا نقدِ صحیح سے یا ایسی رایوں سے جو پورے طور پر اصیلہ ہیں خالی نہیں ہیں لیکن ہم یہاں ان کے متعلق کلام نہ کریں گے کیوں کہ "آرائے اصیلہ" کے تحلیل کے بیان میں ان کا ذکر ضروری ہے۔

**ب۔ آرائے اصیلہ۔** ابن خلدون کے دماغ میں جب تاریخ میں کتاب تالیف کرنے کی فکر جم گئی اور اس نے تالیف کا کام شروع کر دیا تو اسے پتہ چلا کہ تاریخ کو سمجھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے علل و اسباب کو جانے اور احوالِ بشر سے واقف اور علومِ مختلفہ کا ماہر ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ بھی اپنی جمیع تفاصیل کے ساتھ اس کے دماغ میں جما ہوا تھا اس لئے اس نے مقدمہ لکھا اور اس کو "وضع و تالیف کے ساتھ تنقیح و تہذیب سے قبل" پانچ ماہ کی مدت میں پورا کیا، اس میں اپنی رایوں کو منظم کیا اور اپنے نظر و فکر کی نقاب کشائی کی۔ اس مشقت کے نتائج علمِ اجتماع اور حضارۂ اسلامیہ کی تاریخ کائنات اور علمِ تاریخ کا اس کی صحیح بنیادوں پر قائم ہونا ہے۔

## ا۔ تاریخ علومِ فلسفہ میں سے ایک علم ہے اس کا موضوع اجتماعِ انسانی ہے

ابن خلدون کہتا ہے، کہ تاریخ بظاہر اس سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہے کہ اس میں جنگوں اور حکومتوں کے حالات مذکور ہوں اور اس میں اقوال و امثال بیان کئے جائیں مجلسوں میں جب اجتماع کثیر ہو تو اس سے دل چسپی پیدا ہو۔ لیکن درحقیقت وہ نظرِ دقیق اور تحقیق و تحلیل ہے کائنات اور اس کے مبادی کے لئے۔ اور علمِ عمیق ہے واقعات کی کیفیات اور ان کے اسباب کے لئے۔ لہٰذا وہ حکمت میں اصل کے اعتبار سے داخل ہے اور بجا طور پر اس کا مستحق ہے کہ اس کو حکمت کے علوم میں شمار کیا جائے (ص ۳-۴) ابن خلدون اکثر مورخین کی تنقید کرتا ہے کیوں کہ وہ اپنے پیش رووں کی تقلید کرتے ہیں اور یا وہ اپنی کتابوں کو بادشاہوں کے ناموں اور ان کے احوال و کردار کے ذکر پر محدود کر دیتے ہیں۔ اور ایسی بے بنیاد خبریں بیان کرتے ہیں جنھیں عقل صحیح نہیں سمجھتی بلکہ ان کے غلط ہونے پر دلیلِ قطعی موجود ہوتی ہے پس ابن خلدون نے اس کتاب کی تالیف کی ضرورت محسوس کی اور اس کا وصف اس طرح بیان کیا کہ "میں نے تاریخ میں ایک

کتاب لکھی۔۔۔۔ اس میں آبادیوں اور حکومتوں کے شروع ہونے کے علل و اسباب ظاہر کئے ۔۔۔ اور اس کی ترتیب و تبویب میں نادر طریق اختیار کیا اور انوکھا اسلوب ایجاد کیا، اس میں میں نے عمران و تمدن کے حالات اور اجتماعِ انسانی میں پیش آنے والے اُن عوارضِ ذاتیہ کو جس سے تم موجودات کے علل و اسباب معلوم کر سکتے ہو بیان کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تاریخ کو ماخذِ متعددہ کی اور طرح طرح کے علوم کی اور "اچھے غور و فکر اور ثابت قدمی کی جو اپنے موصوف کو صحیح امر کی طرف پہنچائیں اور لغزشیں اور غلطیوں سے بچائیں حاجت ہے۔ اس لئے کہ خبروں میں جب خالی نقل پر اعتماد ہو اور عادت کے اصول اور سیاسی قواعد، آبادی کی طبیعت اور اجتماعِ انسانی کے احوال پر نظر نہ کی جائے اور غائب کو حاضر پر اور موجود کو ماضی پر قیاس نہ کیا جائے تو بسا اوقات ڈگمگا جانے اور لغزش قدم سے اور سچائی کے راستے سے ہٹ جانے سے بچاؤ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ گذشتہ اور آئندہ میں اس سے زیادہ یکسانیت ہے جو ایک پانی کو دوسرے پانی سے ہے۔

ایک مورخ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ احوال، جماعتوں اور خاندانوں کی اس تبدیلی سے غافل نہ ہو جو ان میں زمانہ کی تبدیلی سے آجاتی ہے کیوں کہ یہ تبدیلی زمانۂ دراز کے بعد ہوا کرتی ہے اور یہ اس لئے ہے کہ دنیا کے حالات، عادات اور طور طریق ہمیشہ ایک ڈھنگ پر نہیں رہتے۔ یہ اختلاف زمانہ گزرنے اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونے پر ہوتا ہے۔ پھر یہ اختلاف جس طرح اشخاص، اوقات اور شہروں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح اطرافِ عالم اور ممالک میں اور زمانوں اور حکومتوں میں بھی ہوتا ہے اور یہ تبدیلی بتدریج واقع ہوتی ہے اس لئے کہ یہ تبدیلی انسان کے دوسرے کے مشابہ بننے اور موجودہ حکومت والوں کی خواہش سابق حکومت والوں کی مخالفت کا نتیجہ ہوتی ہے (ص ۵، ۶، ۹، ۱۰، ۲۸، ۲۹) اور اسی وجہ سے تاریخ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ خبر ہے اجتماعِ انسانی کی جو عالم کی آبادی ہے اور خبر ہے ان احوال کی جو اس اجتماع کو طبعاً عارض ہوتے ہیں مثلاً توحش اور باہمی اُنس اور نافرمانی اور بعض انسانوں کا بزور دوسرے انسانوں پر غالب آنا اور اس سے جو سلطنت و حکومت اور اس کے مراتب حاصل ہوتے ہیں اور کسب و معاش اور علوم اور صنعتیں جن کو آدمی اپنی کوششوں

اختیار کرتا ہے اور وہ چیزیں جو اس اجتماع سے طبعاً حادث ہوتی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ خبر میں بالطبع جھوٹ کی گنجائش ہے اور کچھ ایسے اسباب ہیں جو اس کے مقتضی ہیں مثلاً رایوں اور مذہبوں کی گروہ بندی، ناقلین پر اعتماد۔ اور مقاصد سے بے خبری۔ کیوں کہ بہتیرے ناقلین اس چیز کے مقصود کو نہیں جانتے جس کو انھوں نے لکھا ہوا دیکھا ہے یا کسی سے سنا ہے اور وہ خبر کو اپنے ظن وتخمین کے بنا پر نقل کر دیتے ہیں اس بنا پر وہ کذب میں پڑ جاتے ہیں یا مثلاً احوال کو واقعات پر تطبیق دینے سے ناواقفیت، یا مثلاً لوگوں کا بڑے درجہ والوں کا قرب حاصل کرنے کے لئے ان کی مدح وثنا کرنا اور ان کے حالات کو خوشنما صورت میں ظاہر کرنا (ص ۳۵، ۳۶-۴۱)

**۲۔ عمران، انسان کا کسی مقام میں سکونت پذیر ہونا ہے۔** ابن خلدونؒ کے نزدیک اجتماعِ انسانی ہی عمران ہے لیکن مقدمہ کو بنظر غور مطالعہ کرنے سے ان دونوں کے درمیان کھلا ہوا فرق ظاہر ہوتا ہے کیوں کہ عمران، اکثر استعمال میں راجح ہے انسان کے اس تعلق کی طرف جو اس کو ارضِ معمورہ (بیئۃ طبعیہ) کے ساتھ ہے اور اجتماع، طبعاً راجح ہے اس تعلق کی جانب جو ایک جگہ یا متفرق جگوں میں رہنے والوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے (البیئۃ الاجتماعیہ) یا راجع ہے ان صنائع اور قوانین و معاملات کی طرف جن کے وہ رہنے والے حاجت مند ہوتے ہیں اور جو ان کو پہلے تو بیئۃ طبیعیہ کی سختیوں پر غالب آنے کی قدرت بخشتے ہیں پھر راحت طلبی اور آسائش کی زیادتی پر قادر بناتے ہیں۔ زمین کے بعض اقلیم رہنے والوں کے لئے دوسرے بعض اقلیم سے زیادہ موافق ہیں۔ اور معتدل بستیاں اُن بستیوں سے زیادہ آباد ہیں جو زیادہ گرم اور زیادہ سرد ہیں۔ اور اقلیم رابع (معتدل) کے لوگ جسم، رنگ اور اخلاق اور دین میں نہایت معتدل حالت میں ہیں جن بستیوں میں گرمی کی شدت ہے وہاں کے رہنے والوں کا رنگ کالا ہوتا ہے اور ان پر کم عقلی، غصہ اور بے قراری کا غلبہ ہوتا ہے اسی وجہ سے وہ رقص وسرور کے دلدادہ ہوتے ہیں اور حماقت کی صفت سے موصوف ہوتے ہیں۔ سرد بستیوں کے باشندوں میں خاموشی کا غلبہ غمگینی کے درجہ تک پایا جاتا ہے اور وہ نتائج کے لئے متفکر رہا کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض لوگ متواتر دو سال کے لئے کھانے پینے کا سامان غلہ وغیرہ سینت کر رکھتے

ہیں۔ جب کوئی ایک اقلیم سے دوسرے اقلیم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے تو اس کی اولاد کا رنگ روپ، بدن اور اخلاق ایک زمانے کے بعد ہیں اقلیم جدید کے مناسب بدل جاتے ہیں۔ پھر اقالیم کے مختلف ہونے سے غذائیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور ان کا اثر بھی لوگوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ بے شک ارزانی، آرام اور ثقیل غذاؤں سے جسم میں قوت و ہمت کی کمی۔ بیوقوفی اور غفلت اور رنگ کا پھیکا پڑنا اور شکل کا بگڑ جانا پیدا ہوتا ہے جس طرح بھوک کی زیادتی سے جسم اور عقل میں کمی آجاتی ہے لیکن غلہ نہ پیدا ہونے والے مقامات کے لوگ مشقتوں اور فاقوں کی برداشت کی قدرت زیادہ رکھتے ہیں۔

۳۔ اجتماع دو قسم پر ہے (۱) بدوی (۲) حضری۔ اوّل بہ ضرورت ثانی سے سابق اور اس کے لئے مادہ ہے۔ اور وہ دونوں ضروری ہیں۔ جماعتوں کا حالات میں مختلف ہونا ان کے طریق معاش میں اختلاف کی وجہ سے ہے اس لئے کہ ان کا اجتماع تحصیلِ معاش میں تعاون کے لئے ہوتا ہے۔ پس کوئی کاشتکاری اختیار کرتا ہے اور کوئی مویشیوں کی داشت و پرداخت میں مشغول ہوتا ہے۔۔۔ یہ لوگ۔۔۔ صحرا میں وارد ہوتے ہیں کیوں کہ وہاں کھیتیوں اور مویشیوں کے لئے چراگاہوں کی ایسی وسعت ہوتی ہے جو شہروں میں نہیں ہوتی۔ اور اس جماعت کا وجود تمام انسانوں کے لئے ضروری ہے بالخصوص عرب کے لئے۔ اور یہی جماعت کل آبادی کی بنیاد ہے۔

اور اہلِ بدو طبعاً بھلائی کے زیادہ نزدیک ہیں کیوں کہ وہ لوگ فطرت سے قریب ہیں اور طرح طرح کی لذتوں اور آسائشوں کے سامان اور دنیا میں دل لگانے اور خواہشاتِ نفسانیہ میں منہمک ہونے سے بہت دور ہیں۔ اور وہ زیادہ بہادر بھی ہیں کیوں کہ انھیں زیادہ بیداری اور قوت اور ہتھیار لگانے کی حاجت ہوتی ہے، درندوں اور غارت گروں سے اپنی اور اپنے مویشیوں کی حفاظت کے لئے اس میں ان کو صرف اپنے نفس پر اعتماد ہوتا ہے حالاں کہ شہر کے باشندے شہر پناہوں کے بیچ میں سوتے ہیں جو انھیں محفوظ رکھتے ہیں اور چوکیدار ان کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ حاکم یا سردار کے پاس جا کر التجا کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے بادیہ میں رہنا صرف غیرت مند قبائل کا کام ہے۔

## قبائل اہل العصبیتہ

عصبیتہ وہی غیرت اور جوشِ طبیعت ہے عزیزوں اور رشتہ داروں کی حمایت میں اس سے کہ ان کو کوئی سختی یا ہلاکت پہنچے۔ عصبیتہ مشہور خاندان والوں میں ہوتی ہے یا ان لوگوں میں جو ان کے یہاں سسرالی تعلق